ڈاکٹر محمد آصف
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

جدید صنعتی مزدور غزل گو: تنویر سپرا

Dr. Muhhamad Asif
Asst,Professor,Department of Urdu
Bahaudin Zakria University,Multan

Modern Industrial Worker Poet of Urdu Ghazal: Tanveer Sapra

Tanveer Sapra is a modern industrial labourer poet. His themes are mostly the product of pure modern industrial atmosphere mills and machines. With the help of his creativity, he has revolutionized the taste, tools, themes and words of ghazal. His ghazal highlights modern industrial aestheticism not the Maghal one. With the help of his unique, bitter, and rough style, he has set a new literary standard. He is the poet of labourers and presents the needy, the poor and the exploited of this world.

''کتاب ذات کی ورق گردانی کرتا ہوں تو کرچی کرچی خواہشوں اور ریزہ ریزہ خوابوں کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا''، ''رہ گیا فن تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ نہ تو بڑے شعراء کی طرح میرے خیال میں غیب سے مضامین آتے ہیں اور نہ ہی صریر خامہ نوائے سروش ہے۔ میری شاعری افلاکی نہیں خاکی ہے، میری طرح میرے اشعار بھی اپنے رزق اسی کرۂ خاک سے حاصل کرتے ہیں اور اسی باعث میرے قارئین بھی فلک نژاد نہیں خاک زاد ہیں۔ میں اور میرا فن انہیں خاک زادوں کی پہچان اور ترجمان ہے کہ ہر شخص اپنے طبقے کا نمائندہ ہوتا ہے۔''[1] اور یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے:

مضمون خشک، تلخ زبان، لفظ کھردرے — نازک سماعتوں پہ مرے شعر بار ہیں
اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے — دن بھر کی تھکن سے یہ بدن ٹوٹ رہا ہے
آج بھی سپرا اس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے — میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں
دشمنی زر دار سے مجھ کو وراثت میں ملی — میں بھی ہوں مزدور، میرا باپ بھی مزدور تھا

(لفظ کھردرے، ص ۷۷، ۲۳، ۶۷، ۱۷)

یہ تنویر سپرا ہے۔ تنویر سپرا کی شاعری کا تجزیہ کرنے سے قبل اس کی ذات اور فن کے بارے میں اس کا اپنا بیان اور منتخب

اشعار اس لیے درج کیے گئے کہ خود اس کی زبانی کلامی ہمیں ان اشعار اور بیان سے اس کی شخصیت، مزاج، فن اور نظریۂ فن سے ایک مختصر سا تعارف حاصل ہوجاتا ہے اور مزید تجسس انگیخت ہوتا ہے کہ تنویر سپرا کون ہے اور اس کی شاعری کیا ہے؟

تنویر سپرا (اصل نام: محمد حیات سپرا۔ پ:۱۹۳۳ء، دارا پور تحصیل وضلع جہلم، م: ۱۹۹۳ء اسلام آباد، تدفین:جہلم) ایک غریب مزدور قصباتی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تنگ دستی کے باعث رسمی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ لڑکپن ہی میں محنت مزدوری کے لیے کراچی چلے گئے ۔ وہاں بحری جہازوں میں رنگ و روغن کے کام کرتے رہے کچھ عرصہ درزیوں کا کام کیا۔ اس کے بعد جہلم شہر میں دکانداری اور لاہور میں صحافت کرتے رہے۔ لڑکپن کی یہ محنت کشی مختلف مقامات کی خاک چھنواتی ہوئی جوانی میں پاکستان ٹوبیکو کمپنی جہلم (پنجاب) میں لے آئی یہاں ۱۹۵۹ء میں ورکر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس وقت پاکستان پر پہلی فوجی آمریت (۱۹۵۸ء) کے تسلط کو بمشکل ایک سال ہوا تھا اسی دور میں آمریت کے خلاف عوامی جمہوری تحریک میں عملی حصہ لینے کے سبب ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۸۰ء کے بعد مختلف بیماریوں نے آن گھیرا۔ ۱۹۸۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ محنت مزدوری کے ساتھ غیر رسمی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ذاتی محنت و مطالعہ کے سبب ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ سیاست میں عملی حصہ لیا۔ شاعری اور سیاست تقریباً بیک وقت شروع کی۔ (ایوبی آمریت کے ابتدائی دور میں)۔ ابتداء میں ایوب خان کی آمریت کے خلاف مادرِ ملت فاطمہ جناح کی تحریک سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ پھر پاکستان پیپلز پارٹی کی تحریک میں باقاعدہ اور مسلسل سرگرم رہے۔ وہ جہلم میں اس پارٹی کے بانی ارکان میں سے ہیں، شہر اور ضلع کی سطح پر مختلف عہدوں پر فائز بھی رہے، پارٹی کے ترجمان ہفت روزہ ''انکشاف'' جہلم کے مدیر بھی رہے۔ انہوں نے مقامی مزدور تحریک سے باقاعدہ اور عملاً وابستہ ہوکر عملی، نظریاتی اور ادبی خدمات سرانجام دیں۔ مزدور تحریک کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۸ء کی عوامی جمہوری تحریک میں ایک سرگرم سیاسی کارکن اور شاعر کی حیثیت سے شریک رہے۔ جنرل ضیاء الحق کے عہد آمریت (۱۹۷۷-۱۹۸۸ء) میں بیماریوں کے باوجود جمہوری تحریک میں سرگرم رہے۔ اس سلسلے میں ایوبی اور ضیائی آمریت کے دور میں جیل اور مقدمات کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ ۶۴-۱۹۶۳ء میں شاعری شروع کی۔ مرزا طالب گورگانی سے باقاعدہ اصلاح لیتے رہے۔ پہلی شعری تخلیق ''بھوک'' کے عنوان سے لکھی۔ ۱۹۶۹ء میں احمد ندیم قاسمی کے ''فنون'' کے ذریعے پاکستان کے ادبی وشعری حلقوں میں متعارف ہوئے۔ ان کا پہلا اردو مجموعۂ کلام (غزلوں کا مجموعہ) ''لفظ کھر درے'' پہلی بار ۱۹۸۰ء، دوسری بار ۱۹۸۳ء اور تیسری بار ان کی زندگی ہی میں ۱۹۹۳ء میں اردو اور پنجابی کلام کے اضافوں کے ساتھ چھپا۔ ۱۹۸۸ء میں انہیں سابق وزیراعظم پاکستان محترمہ بےنظیر بھٹو کی طرف سے نیشنل بک کونسل آف پاکستان کا عوامی جمہوری ادبی انعام ملا۔[۲]

مندرجہ بالا سوانحی خاکہ پیش کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اس سے تنویر سپرا کی شخصیت اور تخلیقی مزاج اجاگر ہوتا ہے۔ اس سے ایک مزدور شاعر بلکہ مزدور غزل گو کی شکل وصورت ابھر کر سامنے آتی ہے جو محنت مزدوری اور تنگ دستی کے باوجود سیاست اور ادب (شاعری) میں بے حد متحرک ہے۔ تنویر سپرا بنیادی طور پر قیامِ پاکستان کے بعد کا شاعر ہے، آمریت کے شدید خلاف ہے، جمہوریت پسند اور ترقی پسند ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان اور جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے خلاف چلنے والی عوامی جمہوری ادبی اور مزدور تحریکوں سے وابستہ ہے، نظریاتی اور عملی طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کو سپورٹ کرتا ہے۔ چنانچہ تنویر سپرا کے نام کے ساتھ ایک متحرک، انقلابی، ترقی پسند، جمہوریت پسند، عوام دوست، احتجاج اور مزاحمت کرنے والی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس کی یہی

شخصیت غزل کے آئینے میں، ہر شعر میں اپنا واضح اور روشن عکس دکھاتی ہے۔

''لفظ کھردرے'' اس کی واحد شعری تخلیق ہے۔ اس میں ۷۵ اردو غزلیں ۸ اردو نظمیں اور ۹ پنجابی غزلیں شامل ہیں۔ اس کا مطلب ہے (اور مجموعۂ کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ بھی بتاتا ہے) کہ وہ بنیادی طور پر اردو کا غزل گو شاعر ہے۔ مجموعۂ کلام کی ابتدا میں یوسف حسن نے تنویر سپرا کا ایک بے حد مختصر سوانحی خاکہ فراہم کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ''صداقت کی شاعری'' کے عنوان سے ایک مختصر دیباچہ تحریر کیا ہے اور پھر خود تنویر سپرا نے ''اپنی بات'' کے عنوان سے اپنی ذات اور فن کے بارے میں چند سطور درج کی ہیں۔ مجموعہ کے آخر میں ''آہن گر آئینہ گر'' کے عنوان سے یوسف حسن نے اس کی شاعری کا ایک مختصراً تعارف پیش کیا ہے۔ ''لفظ کھردرے'' نیشنل بک کونسل آف پاکستان سے انعام یافتہ ہے جس کا انتساب ہے ''سبط علی سبا اور تنویر جیلانی کے نام جو آج ہم میں نہیں''۔ مجموعے کی ابتداء میں یہ دو اشعار درج ہیں:

بہر عدو جو باعث خلجان بن گئے　　وہ لفظ کھردرے مری پہچان بن گئے

مضمون خشک، قلم زبان، لفظ کھردرے　　نازک سماعتوں پہ مرے شعر بار ہیں

ظاہر ہے کہ دونوں اشعار تنویر سپرا اور اس مجموعے کے شعری مزاج کو سامنے لاتے ہیں۔

تنویر سپرا نے اپنی غزل کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۹۶۴ء-۱۹۷۰ء (۲۶ غزلیں)، دوسرا دور ۱۹۷۱ء-۱۹۷۷ء (۱۵ غزلیں)، تیسرا دور ۱۹۷۷ء-۱۹۹۰ء (۳۴ غزلیں)۔ ادوار کی یہ تقسیم موضوعات و اسالیب کے حوالے سے تو اس لیے غیر ضروری ہے کہ تمام غزلوں میں سپرا کا مکمل مزاج موجود ہے۔ غزلوں کے انتخاب میں ارتقائی کیفیت موجود نہیں بلکہ تمام ادوار کی شاعری میں ایک ہی معیار موجود ہے۔ البتہ یوں محسوس ہوتا ہے یہ تقسیم محض سیاسی اور تاریخی حوالوں سے کی گئی ہے۔ پہلے دور میں ایوبی آمریت کا عہد غالب ہے۔ دوسرا دور ذوالفقار علی بھٹو کا جمہوری دور ہے، جبکہ تیسرا دور جنرل ضیاء الحق کی آمریت اور اس کے بعد بے نظیر بھٹو کے جمہوری دور پر مشتمل ہے۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک اپنی سیاسی پارٹی کے جمہوری دور میں غزلیات کی تعداد بے حد کم ہے۔ غالباً فوجی آمریتوں کے متشدد ادوار نے تنویر سپرا کو انتظامی فریضوں کے ساتھ ساتھ تخلیقی احتجاج پر زیادہ آمادہ کیا ہے جبکہ جمہوری ادوار کے ذہنی سکون نے اس کی توجہ انتظامی فرائض کی طرف زیادہ رکھی ہے۔

پاکستان میں آمریت اور برسرِ اقتدار طبقے کے خلاف چلنے والی صنعتی مزدور اور جمہوری تحریکوں سے وابستگی تنویر سپرا کی زندگی، شخصیت اور شاعری کی تشکیل و تعمیر میں اہم ترین بنیادی عوامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ ابتداء میں تذکرہ ہوا کہ ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں پہلی فوجی آمریت کے ساتھ ہی پاکستان میں جمہوریت پسند، عوام دوست سیاسی و ادبی تحریکیں زیرِ عتاب آئیں اسی دور میں چلنے والی مزدور تحریک سے تنویر سپرا عملاً وابستہ ہوا۔ اس وابستگی نے طبقاتی شعور و کشمکش، جمہوری فکر و احساس اور مزدور طبقے کے استحصال کا واضح احساس اجاگر کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ذاتی محنت و مطالعہ کے بل پر شعر و ادب کے حوالوں سے اپنی قابلیت کو جلا بخشی۔ جب ۱۹۶۴ء میں ایوب خان کی ''آئینی آمریت'' کے خلاف پہلی تحریک جمہوریت چلی تو جدید صنعتی مزدور طبقے اور مزدور تحریک نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ محنت کش تنویر سپرا، جو مزدور تحریک سے وابستہ تھا، اب اس تحریک جمہوریت کے ساتھ وابستہ ہو کر بیک وقت سیاست اور شاعری کے شعبوں میں داخل ہوا اور اپنی پہلی نظم 'بھوک' کے موضوع پر لکھی۔ ''گویا اس کی شاعری

کا آغاز ہی اپنے شخصی اور طبقاتی تجربے کے حقیقت پسندانہ اظہار سے ہوا'' اور ''حقیقت پسندی کی جدید شعری روایت میں ایک نئی آواز-ایک جدید محنت کش کی اپنی آواز'' ابھری۔ ۱۹۶۸ء میں جب عوامی جمہوری تحریک اپنے عروج پر تھی تو تنویر سپرا بھی اس تحریک میں ایک سرگرم سیاسی کارکن اور شاعر کی حیثیت سے شریک تھا۔ درحقیقت ''مزدور تحریک کے بعد اس عوامی جمہوری تحریک میں شرکت کے وسیع عملی تجربے ہی سے اس نے اپنے جوہر کو اچھی طرح پہچانا اور اس کا بھرپور اظہار کرنا شروع کیا'' گویا اس کی شناخت کا آغاز ۱۹۶۸ء کی عوامی جمہوری تحریک کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی دوران احمد ندیم قاسمی کے ساتھ اس کا رابطہ ہوا، ندیم کی فکری وفنی رہنمائی نے اس کے تخلیقی شعور و جوہر کو مزید جلا بخشی، ۱۹۶۹ء میں وہ ندیم کے ''فنون'' کے ذریعے پاکستان بھر کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوا۔[۳-i] ۱۹۵۸ء کے آس پاس اردو ادب میں جدیدیت کے تحت باطن میں جھانکنے کا جو عمل شروع ہوا تھا وہ ۱۹۶۸ء کی عوامی تحریک کے ساتھ خارج کی طرف مڑنا شروع ہوا۔ ایک لحاظ سے خارج اور باطن کی ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ اس کے لیے نو ترقی پسندی کی اصطلاح وضع ہوئی۔ غیر نظریاتی پن کے بجائے نظریاتی بحثیں دوبارہ شروع ہوئی لیکن یہ حقیقت نگاری ۱۹۳۶ء کی طرح محض پرانی ترقی پسندی یا خارجی حقیقت نگاری نہ تھی بلکہ اس میں حقیقت نگاری کے ساتھ باطنی دروں بینی کی دبازت بھی تھی۔ البتہ اس میں غیر نظریاتی پن کے بجائے نظریاتی وابستگی موجود تھی۔ یہ خارجی اور باطن کے نیا امتزاج تھا۔ یہ ایک نیا عوامی ردِعمل تھا۔ اس میں ذاتی تجربات کے ساتھ خارجی مزاحمتی رویے بھی تھے۔ اس میں ذاتی علامتوں کے ساتھ اجتماعی علامتیں بھی تھیں۔ اس میں باطنی مسائل کے ساتھ خارجی حقیقت نگاری کو اسلوب و اظہار اور فنی جمالیات سے ہم آہنگ کیا گیا تھا۔ اس کو نو ترقی پسندی کہا گیا گویا یہ ترقی پسندی اور جدیدیت کا امتزاج تھا اور ایک طرح سے ترقی پسند تحریک کا نئی سطح پر احیاء۔ جس کے رویے ترقی پسند تحریک سے جڑے ہونے کے باوجود فی، ہیئتی، اسلوبی اور موضوعات سطح پر مختلف تھے۔[۳-ii] تنویر سپرا اسی ترقی پسندی یا نو ترقی پسندی کے سرکردہ غزل گوشعرا میں سے ہے۔ اس کی غزل اس کی اپنی فعال زندگی کے تجربات و مشاہدات سے ابھری ہے، وہ خود عملی طور پر جدید صنعتی محنت کش اور مزدور ہے اور اس کی غزل بھی جدید محنت کش اور مزدور طبقے کی مزاحمتی آواز ہے۔

اردو شاعری میں ''سرمایہ ومحنت'' کی کشمکش اور جدید صنعتی مزدور طبقے کو سب سے پہلے اقبال نے شعوری طور پر اپنا موضوع بنایا تھا۔ (اقبال کے حوالے سے ایک نظم تنویر سپرا نے بھی کہی ہے ''خوابِ تعبیر'')۔ (دیکھئے: لفظ کھر درے، ص۱۱۶)

مثلاً بانگِ درا کی نظم خضرِ راہ، بالِ جبریل کی متعدد غزلیں، بالِ جبریل کی نظمیں ''لینن خدا کے حضور میں''، ''فرشتوں کا گیت''، ''فرمانِ خدا''، ''الارض للہ''، ضربِ کلیم کی متعدد نظمیں مثلاً ''اشتراکیت''، ''کارل مارکس کی آواز''، ''انقلاب''، ''نفسیاتِ غلامی''، ''بلشویک روس''، ''خواجگی'' وغیرہ، ارمغانِ حجاز کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' وغیرہ۔ غرض اقبال نے پہلی دفعہ اشتراکیت اور سرمایہ دار جمہوریت، ''سرمایہ ومحنت''، ''بندۂ مزدور''، ''دستِ دولت آفریں''، ''خواجگی'' (خضرراہ)، ''انقلاب'' (ضرب کلیم)، امیر مال مست، فقیر حال مست (فرشتوں کا گیت)، ''سلطانی جمہور''، ''دہقاں'' (فرمانِ خدا)، جیسے عنوانات اور تراکیب کے ذریعے صنعتی مزدور طبقے کو نمایاں طور پر موضوع بنایا، سرمایہ دار کے مکروفریب اور مزدور کی انتہائے سادگی کا بھرپور شعری اظہار کیا اور مزدور کو ''نغمۂ بیداریٔ جمہور'' کی دعوت دی۔ اقبال کے بعد ترقی پسند شعراء نے اس روایت کو تسلسل و استحکام بخشا۔ عموماً یہ تمام شعراء خود مزدور نہیں تھے (علاوہ احسان دانش کے۔ ان کا تذکرہ آگے آتا ہے) تاہم انہی کی پروان چڑھائی ہوئی موضوعاتی وفنی روایت سے استفادہ کرتے ہوئے ''صنعتی مزدور طبقے کے (مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے) اپنے اردو شعراء اپنی طبقاتی ترجمانی آپ کرتے ہوئے

سامنے آئے۔ ہمارے پنجاب بلکہ سارے پاکستان میں اس طبقے کے اپنے اردو شعراء کا کہیں ساتویں عشرے میں پہلی بار ظہور ہوا۔ ان کی اس شناخت کا آغاز ۱۹۶۸ء کی عوامی جمہوری تحریک کے ساتھ ہوتا ہے۔[۴] پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات اور اپنی ذاتی عوامل ومحرکات کے سبب اس طبقے کے جو اپنے اردو شعراء اعلیٰ فنی جمالیاتی معیاروں اور اپنی شناخت کے ساتھ ملک گیر سطح پر متعارف ہوئے ان میں سے چند نمایاں نام بقول یوسف حسن، تنویر سپرا، علی مطہر اشعر، سبط علی سبا اور نظیر اختر کے ہیں[۵] اور بلا شبہ ان میں تنویر سپرا کا نام جدید صنعتی مزدور غزل گو کی حیثیت سے کسی تعارف کا محتاج نہیں اس نے ''دنیائے ادب میں مزدوروں کی نیابت سے اپنی پہچان کرائی''۔[۶] اس نے خود بھی دنیائے ادب میں اپنی پہچان یہی بتائی ہے کہ وہ ''مزدور'' ہے اور ''مزدور کا مندوب'' ہے۔

میری یہی پہچان ہے دنیائے ادب میں
مزدور ہوں، مزدور کا مندوب ہوا ہوں

(لفظ کھردرے، ص۱۰۶)

یوسف حسن نے سرمایہ ومحنت اور صنعتی مزدور طبقے سے متعلقہ شعری روایت میں اقبال اور ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے ہوئے احسان دانش کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ اردو شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے طلباء جانتے ہیں کہ احسانِ دانش ''شاعرِ مزدور'' ہے۔ بالخصوص اس وقت تو اسے نظر انداز کرنا کسی طور ممکن نہیں جب ایسے مزدور شعراء کی شعری روایت کا ذکر ہو رہا ہو جن کا تعلق بذاتِ خود مزدور طبقے سے ہو۔ احسان دانش خود مزدور تھے اور انہوں نے مزدوروں کے لیے ایک وافر ذخیرۂ شاعری تخلیق کیا۔ ان کے ہاں دولت و غربت اور مزدور و سرمایہ دار سے متعلق شاعری محض کتابی اور علمی باتیں نہیں بلکہ ایک مزدور کے ذاتی تجربے اور مشاہدے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ بندۂ مزدور کے تلخ اوقات اور سرمایہ دار و کرد کار کا ظلم و استبداد اپنی شاعری میں سموتے ہیں تو یہ افکار و جذبات، احساسات وتصورات ان کے دل سے پھوٹتے ہیں اس لیے میں ان میں اصلیت و واقعیت، خلوص، ہمدردی و درمندی، سوز اور تازگی ہے۔ یہ باتیں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر نہیں کی گئیں، یہاں نہ احسان دانش کی شاعری کا تجزیہ مقصود ہے اور نہ تنویر سپرا سے ان کا موزانہ، لیکن جب مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والی شعری روایت کا ذکر ہو تو احسان دانش کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ یہاں تحقیقی تقاضوں کے پیش نظر چند نظموں کے عنوانات اور ایک آدھ شعر درج کیا جاتا ہے دیکھئے: ''قرآن اور مزدور''، ''محتاج حسینہ''، ''پرستش اور مزدور''، ''مزدور کی موت''، ''مزدور کی لاش''، ''جشنِ بیچارگی''، ''مزدور کا مہمان''[۷] اور غزل کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

احسان گھر نہیں تو نہ ہو یہ بھی کم نہیں
اینٹوں کا ایک ڈھیر ابھی تک وطن میں ہے [۸]

احسان دانش کے نظریات سے اختلاف کرنے کا ہر کسی کو حق ہے لیکن اس میں کس کو کلام ہوسکتا ہے کہ مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے عظیم شاعر ہیں بلکہ جدید مزدور طبقے سے ابھرنے والے پہلے باقاعدہ شاعر مزدور ہیں۔ وہ خود اپنی طبقاتی ترجمانی کرنے والے مزدور شعراء کے امام اور بنیاد گزاروں میں سے ہیں۔ وہ کسی سیاسی یا ادبی تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ تاہم اپنے گردوپیش کے ملکی وبین الاقوامی حالات سے متاثر تھے اور ترقی پسند تحریک سے نظریاتی اختلاف کے باوجود اس کے اثر پذیر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان سے قبل اور پھر پاکستان میں، مزدور طبقے کی اپنی عوامی ادبی جمہوری تحریک سے قبل، احسان دانش تنہا اور باقاعدہ اس کی

مثال ہیں اور اپنے مزدور طبقے کے بذاتِ خود ترجمان اور ایک شعری و ادبی تحریک ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ احسان دانش مزدور طبقے سے ابھرنے والے مزدور شعراء کے پیش رو ہیں۔ تنویر سپرا دراصل اسی مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے شاعروں کی شعری روایت کا تسلسل ہے۔ وہ بھی شاعرِ مزدور ہے لیکن باقاعدہ طور پر سیاسی ادبی تحریکوں سے وابستہ ہے۔ وہ مزدور غزل گو ہے (احسان دانش کا رُخ نظم کی طرف ہے)۔ اس کی شخصیت کی تشکیل میں جہاں اس کے ذاتی حالات کا عمل دخل ہے وہاں وہ باقاعدہ طور پر پاکستان کے سیاسی (آمرانہ و جمہوری) حالات اور صنعتی مزدور طبقے کی عوامی ادبی تحریکوں سے اثر پذیر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ صنعتی مزدور طبقے کے اپنے اردو شعراء کی اپنی طبقاتی ترجمانی میں ان کا سرکردہ و نمائندہ۔ چنانچہ وہ احسان دانش کی مزدور شعری روایت کو آگے بڑھانے والا شاعر ہے۔ وہ ''پاکستان'' کے جدید صنعتی محنت کشوں میں سے ابھرنے والا ایک منفرد جدید حقیقت پسند شاعر ہے۔[9] یہی وجہ ہے کہ اس کے موضوعات، اسالیب اور لفظیات ۱۹۶۰ء کے بعد پنجاب (پاکستان) کے کارخانوں، صنعتوں اور مشینوں کے شور اور سیاسی و معاشی بحران سے ابھرے ہیں۔ اس کی آواز حقیقت پسندی پر مبنی جدید غزل گوئی کی روایت میں ایک جدید محنت کش غزل گو کی جدید آواز ہے۔

تنویر سپرا اپنے محنت کش ہونے کا برملا اعتراف کرتا ہے۔ ہمارے معاشی نظام میں جس طرح مزدور کو بے توقیر کیا جاتا ہے اور اس کی انا مجروح کی جاتی ہے، وہ اس پر اپنے کرب کا اظہار کرتا ہے اور اس لیے اسے دکھ ہے کہ اس کے فن اور پیشے کے مابین بُعد ہے، وہ باہر دانش ور شاعر اور ادیب ہے لیکن پیشے کے لحاظ سے ایک ''مزدور''، ''مل مین'' اور ''ایک آئل مین''۔

کتنا بُعد ہے میرے فن اور پیشے کے مابین
باہر دانشور ہوں لیکن مل میں آئل مین

(لفظ کھردرے، ص۲۱)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں اس نے پیشے اور فن کے مابین فاصلے کو ختم کر دیا ہے اس نے شاعری اور مزدوری، شاعر اور مزدور کو اس طرح ہم آمیز کیا ہے کہ مزدور کی پوری شخصیت، اس کی پکار، اس کی فریاد، اس کے دکھ درد، جذبہ و احساس اور اس کے پریشانیاں، اس کی مفلسی، اس کا احتجاج غزل میں ڈھل کر نغمہ بن گیا ہے۔ جبھی تو احمد ندیم قاسمی یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ:۔

''اس کی شاعری نے اس کے فن اور پیشے کے مابین تفاوت ختم کر دیا ہے اور اس نے شاعری اور مزدور کو یوں باہم آمیخت کیا ہے کہ کم سے کم میں تو یہ سوچتا ہوں کہ اگر تنویر سپرا مزدور ہونے کے ناطے اتنے بے شمار تجربات محسوسات اور مشاہدات سے لدا پھندا نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح کے سچے اور کھرے اشعار کہہ سکتا۔''[10]

تنویر سپرا کی غزل اس کے ذاتی تجربات و مشاہدات اور اس کی اپنی شخصیت سے پھوٹی ہے۔ اس کی غزل میں اس کی زندگی اور شخصیت کی، گویا، ایک بے چین مزدور کی تصویر ابھرتی ہے جس کا بدن دن بھر کی مشقت سے ٹوٹ رہا ہے۔ جو دن بھر بچوں کی خاطر مزدوری کرتا ہے اور شب کو اپنی غیر مکمل غزلیں پوری کرتا ہے۔ لوگوں کے دکھ درد کا ساتھی ہے لیکن خود بے چین ہے، وہ شاعرِ مزدور ہے، اس کی جیب میں کاغذ اور پینسل ہے لیکن ہاتھ میں آئل کین۔ المیہ یہ ہے کہ اس کی محنت کا پھل جنٹلمین کھا جاتے ہیں۔ اس کی قسمت میں آنسو ہیں اور سیٹھوں کی قسمت میں بیئر، وہسکی، کاریں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں اس کی، ایک مزدور کی تلخ اوقات پر

مبنی متحرک لیکن تلخ تصاویر دیکھیے اور ساتھ ہی استحصالی طبقوں کا استبداد اور ان کے خلاف احتجاج اور شدید طنز۔

دن بھر تو بچوں کی خاطر میں مزدوری کرتا ہوں　　شب کو اپنی غیر مکمل غزلیں پوری کرتا ہوں
آج بھی سپرا اس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے　　میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں
اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے　　دن بھر کی تھکن سے یہ بدن ٹوٹ رہا ہے
کانوں میں ہے شور کلوں کا ذہن میں گونجیں شعر　　پاکٹ میں کاغذ اور پنسل ہاتھ میں آئل کین
جتنا بڑھیا مال بناؤں لے جائے زر دار　　اپنا سینہ گھٹیا سگریٹ سے پھونکوں دن رین
بیئر، وہسکی، بنگلہ، کاریں سیٹھوں کی جاگیر　　میری قسمت آہیں، آنسو، نالے، چیخیں، بین
میں جاہل، میں غیر مہذب، میں کافر، میں چور　　میری محنت کا پھل کھانے والے جنٹلمین
مل سکتی ہیں ہم دونوں کی سوچیں یہ مت سوچ　　میں اور میرا آجر ہیں اس دھرتی کے قطبین
میں مزدور ہوں سگریٹ مل کا سپرا میرا نام　　لوگوں کے دکھ درد کا ساتھی لیکن خود بے چین

(لفظ کھردرے، ص۲۳، ۶۷، ۲۱، ۲۲)

تنویر سپرا کی غزل ہمیں اس کی داستانِ حیات سناتی ہے۔ اس داستان میں درد ہے۔ سوز ہے، شدتِ جذبات ہے، احتجاج و مزاحمت ہے اور خلوص ہے لیکن اگر اشعار کو غور سے دیکھا جائے تو اس کی شاعری محض اس کی شخصیت ہی کی عکاس نہیں بلکہ پاکستان کے صنعتی مزدور طبقے کی ترجمان ہے، جس کے دکھ درد کو اس نے اپنی ذات کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

تنویر سپرا کی شاعری مزاحمتی اور احتجاجی ادب کی پائندہ و تابندہ مثال ہے۔ اس کے ہاں ظلم ڈھانے والے طبقوں کے خلاف اور مزدوروں کے شدید اور ناقابلِ برداشت کرب پر ایک زبردست احتجاج اور مزاحمت موجود ہے بلکہ بعض اوقات وہ چیخ اٹھتا ہے لیکن اس چیخ میں، اس احتجاج میں رقت نہیں۔ وہ نوحہ گری، اور رحم طلبی کا رویہ اختیار نہیں کرتا۔ اس کی شاعری صحت مند احتجاج اور مزاحمت کی شاعری ہے۔ اس کا مزدور خود ترحمی کا مریض نہیں۔ وہ اپنا اثبات اور استحکام چاہتا ہے۔ اس لیے وہ طبقاتی تضادات کو مقدر سمجھ کر قبول نہیں کرتا اور اسی لیے وہ بڑے اعتماد اور شخصی حوصلے کے ساتھ بتاتا ہے میں بھی مزدور ہوں میرا باپ بھی مزدور تھا لیکن اپنے باپ کی طرح مُردوں کی طرح جینا میرا وصف نہیں۔ تاہم زردار سے دشمنی مجھ کو وراثت ہی میں ملی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار پر غور کیجئے جو ہمارے مندرجہ بالا بیانات کی تصدیق کرتے ہیں:۔

دشمنی زردار سے مجھ کو وراثت میں ملی　　میں بھی ہوں مزدور مرا باپ بھی مزدور تھا
اپنی تاریخِ نسب پر اس لیے نازاں ہوں میں　　عظمتِ محنت مرے اجداد کا منشور تھا
مُردوں کی طرح جس میں مرا باپ جیا ہے　　وہ صورتِ حالات نہیں چاہیے مجھ کو
مزدور ہوں محنت کا صلہ مانگ رہا ہوں　　حق دیجئے خیرات نہیں چاہیے مجھ کو

میں جاہل، میں غیر مہذب، میں کافر، میں چور　　میری محنت کا پھل کھانے والے جنٹلمین
میں دھول ہوں تو مجھ کو خلا میں بکھیر دے　　میں چاند ہوں تو مجھ کو سجا آسمان پر
اس نگر کا نام بھی سپرا شرافت پور تھا　　جن کے ہر انسان میں اک بھیڑیا مستور تھا
اونچے اونچے کاخ گریں گے دھول اڑے گی لانوں میں　　اب کے ایسی جنگ چھڑے گی جھگیوں اور ایوانوں میں

(لفظ کھردرے، ص۷۷، ۸۳، ۲۲، ۴۷، ۷۷، ۵۹)

دراصل تنویر سپرا ان مزدور شعراء میں سے ہے جو مقتدر طبقات کی ستم ظریفی مقدر سمجھ کر قبول کرنے کے بجائے ترقی پسند شعور اور شخصی حوصلہ کے ساتھ عملی جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے طبقے کو بھی اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کا طبقہ جو خوفزدہ، احساسِ محرومی و بیچارگی کا حامل طبقہ ہے، جو اپنے اندر سمٹا ہوا ہے، وہ انہیں اپنی ذات سے باہر آ کر سکوتِ مسلسل کو توڑنے، حق بات کا سرِ عام اعلان کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

نعروں پہ قدغنیں ہیں تو چیخیں بلند کر　　اب لوگ اس سکوتِ مسلسل سے تنگ ہیں
موجود تھا، موجود ہوں موجود رہوں گا　　تم دفن کرو صورتِ سبزہ میں اٹھوں گا
کمروں کی سیاست مرا منشور نہیں ہے　　جو بات کروں گا وہ سرِ عام کروں گا
حق بات کا اعلان سرِعام کروں گا　　میں آج یہی سوچ کے مجذوب ہوا ہوں

(لفظ کھردرے، ص۹۸، ۱۰۹، ۱۰۶)

تنویر سپرا کی غزل، شخصیت اور زندگی دیکھ کر فیض کا وہ مشہور قول یاد آتا ہے جو انہوں نے ''دستِ صبا'' کے ''ابتدائیہ'' میں لکھا ہے:

''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔'' اور ''حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا تقاضا بھی ہے۔ فن زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اس جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔''[۱۱]

تنویر سپرا کی غزل اسی مشاہدے اور مجاہدے، اسی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت کی مؤثر مثال ہے۔ اس کی شاعری اس جدوجہد کی فعال ترجمان ہے۔ مجاہدے کی اسی سختی اور اپنی آئیڈیالوجی پر پختہ ایمان کی بدولت ہی اس کی شاعری میں رزمیے کا انداز ہے۔ اس کا رویہ منفی قوتوں کے خلاف جارحانہ رزم آرائی کا ہے۔ اس کے ہاں جہالت، مفلسی، غلامی اور استحصالی طبقات کے خلاف واضح طور پر ایک اعلانِ جنگ ملتا ہے۔

اونچے اونچے کاخ گریں گے دھول اڑے گی لانوں میں　　اب کے ایسی جنگ چھڑے گی جھگیوں اور ایوانوں میں
اے جاگیروں کے مختارو! اب وہ لمحے دور نہیں　　سرخ پھر پرے لہرائیں گے جب کھیتوں کھلیانوں میں

ان لوگوں کے جسموں کے بھی ٹکڑے ہونے والے ہیں　　دھرتی کو جو بانٹ چکے ہیں چھوٹے چھوٹے خانوں میں
میرے اندر کے انساں نے میرے منہ پر تھوکا ہے　　درویشوں کو چھوڑ کے جب بھی بیٹھا ہوں سلطانوں میں
بانجھ عقیدوں کی دیواریں توڑ کے باہر نکلو بھی　　کب تک قید رہو گے سپرا ماضی کے زندانوں میں

(لفظ کھر درے، ص۵۹)

تنویر سپرا جذباتی، رومانی شاعر نہیں۔ وہ باشعور ترقی پسند تخلیق کار ہے۔ اس لیے اس کے ہاں محض تخریب، نفی اور لا کا پہلو ہی نہیں بلکہ تعمیر، اثبات، اور الاّ کا پہلو بھی موجود ہے۔ وہ منفی اقدار اور قوتوں کی محض نفی ہی نہیں کرتا بلکہ مثبت اقدار اور طاقتوں کا اثبات بھی چاہتا ہے۔ وہ صرف دیواروں کو گرانے کا مشورہ ہی نہیں دیتا بلکہ ان کی بنیادوں پر نئی عمارتوں کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ وہ اقبال اور ترقی پسند شعراء کے اس خواب کا امین ہے جو انہوں نے ایک غیر استحصالی غیر طبقاتی سماج کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ ایک ایسا گھر تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی فضا ایک قبیلے کی طرح ہو۔ جو امن و محبت، مساوات اور خوشحالی سے بھرپور جزیرے کی حیثیت رکھتا ہو۔ تنویر سپرا کی شاعری میں جگہ جگہ ''ماں'' کا تذکرہ ملتا ہے۔ ماں کی بھرپور محبت نے اس کی ذات کو استحکام بخشا ہے۔ اس لیے کہ جب بھی دن بھر کی مشقت کے سبب تھکن سے بدن ٹوٹا تو ماں نے اسے گود میں لیا ہے۔ تنویر سپرا ماں کی گود کو پرسکون گھر اور وطن تک پھیلا دیتا ہے۔ وہ ایسا مثالی سماج، ایسا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جو ماضی کے اوصاف سے متصف ہو، ایسا مثالی گھر تعمیر کرنا چاہتا ہے جو سکھ دینے میں ماؤں سا ہو۔ یہ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے　　دن بھر کی تھکن سے یہ بدن ٹوٹ رہا ہے
ایسا گھر تعمیر کریں جو سکھ دینے میں ماؤں سا ہو　　سردی ہو تو دھوپ صفت ہو گرمی ہو تو چھاؤں سا ہو
غموں کی دھوپ میں برگد کی چھاؤں جیسی ہے　　مرے لیے مری ہمشیر ماؤں جیسی ہے

(لفظ کھر درے، ص ۶۵، ۱۵۲، ۲۸)

سپرا کے نزدیک اس ''نظام زر'' نے زمانے کو ''ڈاکے، فریب، جھوٹ، ریا اور قتل کے سوا کچھ نہیں دیا (لفظ کھر درے، ص۱۵۰)۔ اس صنعتی مشینی دور کی مادہ پرست اخلاقیات، منافقت، جھوٹ اور استحصال سے ماں کی آغوش ہی محفوظ رکھ سکتی ہے۔ صنعتی عہد کی مادہ پرستی کے برعکس ''ماں'' محنت و اخلاص اور انسانیت کا استعارہ ہے۔ اسی لیے معاشرے، سماج اور وطن کو ماں کی آغوش سا ہونا چاہیے۔

قربانی، اخلاص، محبت، خلق سکھائیں مائیں　　سپرا ہم کو آدم سے انسان بنائیں مائیں
سردی، گرمی، آندھی، طوفان، اولے، حبس، اندھیرے　　ہر سختی سینے پر سہہ کر بال بچائیں مائیں

(لفظ کھر درے، ص۱۵۱)

(یہ غزل ۵ اشعار پر مشتمل ہے، ماں سے متعلق ہے، اور ردیف بھی ''مائیں'' ہے)

تنویر سپرا نے جدید نوآبادیاتی نظام کے استبداد اور تضادات کو موضوع بنایا ہے۔ تنویر سپرا پاکستان کا باشندہ ہے اور پاکستان بھی

جدید ترین نوآبادیاتی نظام کے پیچیدہ ترین جالوں میں جکڑا ہوا خطہ ہے۔ نو استعماری، ہوسنا کی، تشدد، بالادستی، استحصال، سفا کی، معاشی و اخلاقی تضادات اس کے برعکس محکوم باشندوں کی محرومی و غربت، ذہنی مرعوبیت اور محکومیت۔۔۔ یہ تمام معاشی سماجی اخلاقی تضادات اس کے موضوعات ہیں۔ جدید نوآبادیاتی نظام یا جدید معاشی استعمار مقامی مقتدر طبقات کے ذریعے اپنے آپ کو مستحکم کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ محکوم کی انا کو مکمل شکست و ریخت، خوف، احساس کمتری، مرعوبیت اور محرومی کا شکار رکھا جائے۔ محکوم و مجبور کے اعصاب پر غیر پیداواری محنت اس طرح مسلط کردی جاتی ہے کہ وہ سوائے مشینوں کے شور کے کوئی اور صدا سن ہی نہیں سکتا۔ وہ احساس سے عاری باشندہ ہوتا ہے۔ سارتر کے الفاظ میں نوآبادیات کا شکستہ، فاقہ زدہ، بیمار اور خوف زدہ ''دیسی باشندہ''[۱۲] تنویر سپرا نے استعماری سماج میں موجود سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی تضادات اور طبقاتی کشمکش کو موضوع بنا کر اسی فاقہ زدہ ،شکستہ، بیمار، خوف زدہ، دیسی اور زرد باشندے کو زندہ، صحت مند، آسودہ اور جی دار بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے اس کے ہاں جس مزدور کی شخصیت ابھرتی ہے وہ نوآبادیات کا دیسی، زرد اور فاقہ زدہ باشندہ ہونے کے باوجود خوف زدہ، بیمار اور ذہنی طور پر شکستہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنی ذات کے اثبات پر پُراعتماد ہے۔ وہ اپنے بنیادی حقوق سے محرومی پر پرزور احتجاج اور مزاحمت کرتا ہے گویا وہ نوآبادیات میں چلنے والی ان مزاحمتی تحریکوں کا نمائندہ ہے جو کسان مزدور تحریکیں ہیں، جو عوام دوست سیاسی ادبی جمہوری تحریکیں ہیں۔ یہ ''زرد لوگ'' وہ ہیں جو استحصالی طبقوں کی پور پور سے اپنے حق کی سرخی نچوڑ لینا جانتے ہیں۔

آج بھی سپرا اس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے — میں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں
اب تک مرے اعصاب پہ محنت ہے مسلط — اب تک مرے کانوں میں مشینوں کی صدا ہے
نعمت کدے کو کھول دے ورنہ یہ ''زرد لوگ'' — سرخی نچوڑ لیں گے تری پور پور سے
لگتا ہے اب یہ ہاتھ سے کشکول پھینک کر — چھینیں گے تم سے روٹیاں بانہوں کے زور سے
بجھا سورج تو روشن کرلیا اپنا لہو ہم نے — کہ تاریکی میں جنگل کا سفر اچھا نہیں ہوتا

(لفظ کھردرے، ص۲۳، ۶۷، ۹۰، ۱۴۶)

اپنی ذات پر یہ اعتماد، یہ شعور و ادراک ایک طرف اسے اپنی ماں کی محبت بھری نرم آغوش نے بخشا ہے تو دوسری طرف جدید صنعتی مزدور تحریکوں اور عوامی، ادبی، سیاسی تحریکوں کے ساتھ فکری و عملی رفاقت سے اسے مزید مستحکم کیا ہے۔ خاص کر وہ جس سیاسی پارٹی سے وابستہ تھا اس نے محروم عوام کو جو اعتماد اور خودداری عطا کی اس کا اعتراف عموماً سب نے کیا ہے چاہے وہ مخالف ہوں یا حمایتی۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے اپنے مضمون ''بھٹو صاحب-میری نظر میں'' میں جہاں بھٹو کو جاگیردارانہ مزاج کا حامل رہنما قرار دیا ہے وہاں بھٹو کی ذہانت و فطانت کا اعتراف کرتے ہوئے برملا اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ :۔

''مورخین کے بقول بھٹو کے عظیم کارناموں کی فہرست میں اہم ترین خدمت قوم کی شکست یافتہ ذہنیت کو خود اعتمادی کی بلندیوں پر پہنچا دینا ہے۔ میں نے بھٹو صاحب کے دور کو قربت اور شعور کی آنکھ سے دیکھا ہے۔۔۔ میری باطن کی آنکھ ان کے جس کارنامے کو تاریخی کارنامہ اور حیرت انگیز شعبدہ سمجھتی ہے وہ پسے ہوئے، جکڑے ہوئے اور محرومیوں کے مارے ہوئے عوام میں بیداری پیدا کرنا، ان میں خود اعتمادی کی لہر پیدا کرکے انسانی مساوات اور معاشرتی برابری کا شعور اجاگر کرنا، صدیوں کی غلامانہ

ذہنیت کو آزادی کا احساس دلانا، اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کے ارادے کو منظّم و مضبوط بنانا۔۔۔ سچی بات یہ ہے بھٹو صاحب کے ساڑھے پانچ سالہ دورِ حکومت میں یہ معاشرتی اور شعوری ارتقا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔''[۱۳]

اس عوامی بیداری اور معاشرتی و شعوری ارتقا کی واضح اور تخلیقی مثال تنویر سپرا اور اس کی غزل ہے۔ دونوں اسی پسے ہوئے، جکڑے ہوئے، محرومیوں کے مارے ہوئے عوام سے ابھرے ہیں۔''اس کی شاعری آج کے دور کے ان لوگوں کے جذبوں کی مظہر ہے جن کی سوچ پر بالائی طبقوں کی مریضانہ الجھنوں کا سایہ تک نہیں پڑا۔''[۱۴]

تنویر سپرا مجموعی طور پر بلند آہنگ لہجے کا شاعر ہے۔ اس کے لہجے میں تندی، تلخی، تیزی، کاٹ اور طنز کی شدت ہے۔ اس میں ایک سپاٹ پن، کھردرا پن، خشکی، کرختگی اور تلخی ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ دراصل تنویر سپرا واضح طور پر ایک غیر مبہم نقطۂ نظر اور اعلانیہ وابستگی کا شاعر ہے اس کا فن علی الاعلان ایک مخصوص آئیڈیالوجی کا ترجمان ہے۔ وہ تو خود کہتا ہے کہ''حق بات کا اعلان سرِ عام کرونگا۔ کمروں کی سیاست میرا منشور نہیں ہے جو بات کروں گا وہ سرِ عام کروں گا''۔ (لفظ کھردرے، ص۱۰۶، ۱۰۹)

عموماً شاعری کو نعرے بازی اور''پروپیگنڈا'' کہا جاتا ہے۔ کیا واقعی تنویر سپرا نعرے بازی اور پروپیگنڈا کرتا ہے؟ اگر تنویر سپرا کی غزل کے موضوعات اور اسالیب کا بادقت تجزیہ کیا جائے تو واضح طور پر محسوس ہوجاتا ہے کہ اس کی شاعری اس منہاج پر ہے جہاں اعلانیہ وابستگی اور آئیڈیالوجی بھی شعر کے روپ میں ڈھل جاتی ہے، جہاں پروپیگنڈا شعر کے روپ میں ڈھل کر پروپیگنڈا نہیں رہتا شعر بن جاتا ہے، جہاں کھردری زندگی اور تلخ خیالات بھی تخلیق کی مٹھاس میں ڈھل جاتے ہیں۔ اردو غزل میں یہ انقلاب سب سے پہلے حالی نے پیدا کیا اور اسے عروج پر اقبال نے پہنچایا۔ بیسویں صدی میں غزل کے مزاج، لفظیات، موضوعات اور اسالیب میں یہ انقلاب اقبال کی دین ہے (مثلاً بالِ جبریل کی غزلیات) لہجے اور مزاج میں یہی انقلاب یگانہ سے ہوتا ہوا تنویر سپرا تک پہنچا ہے اور تنویر سپرا نے جرأت اظہار کے ساتھ اس انقلاب میں مزید تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ تنویر سپرا کا لہجہ بالخصوص یاس یگانہ چنگیزی کے لہجے کو آگے بڑھاتا ہے مثلاً یگانہ کے چند اشعار دیکھئے:

حسنِ کافر گناہ کا پیاسا — بے گناہوں کو سانحے والا
چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے — میں کہاں ہار ماننے والا
شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ — انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا — مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا
علم کیا علم کی حقیقت کیا — جیسی جس کے دھیان میں آئی
خداؤں کی خدائی ہو چکی بس — خدا را بس، دہائی ہوچکی بس [۱۵]

دیکھئے وہی لہجہ ہے بلند بانگ، تیز، کاٹ دار بظاہر سپاٹ اور کھردرا لیکن درحقیقت سہل ممتنع کا حامل اور اسی لیے تخلیقی رس سے لبریز۔ دراصل لہجے میں ادبیت و شعریت کا تعلق موضوع سے ہے۔ موضوع کے مطابق ہی لب و لہجہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ یعنی مطابقتِ لفظ و معنی۔ یہ شعریت کی معراج ہے۔ موضوعات تلخ ہیں تو فطری طور پر لہجہ بھی تلخ اور تیز ہوگا۔ سپرا کا کلام لفظ و معنی کی

اسی مطابقت کا شاہد ہے۔ اس نے زندگی کے نہایت تلخ حقائق کو نہایت حسن اور سلیقے کے ساتھ سمویا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ اس کی غزل میں ''دریا کا شور'' ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لہجہ نہ دیکھ بات کا مفہوم سمجھ۔ ذرا ٹھہر کے ''صدائے کرخت'' کو سن۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کی غزل میں مضمون خشک، زبان تلخ اور لفظ کھردرے ہیں اور نازک سماعتوں پہ اس کے اشعار بار گزرتے ہیں۔(اس کے مجموعے کا نام بھی 'لفظ کھردرے' ہے)

مضمون خشک، تلخ زباں، لفظ کھردرے
نازک سماعتوں پہ مرے شعر بار ہیں

(لفظ کھردرے، ص۱۳۱)

ظاہر ہے جب مضمون خشک اور تلخ ہوگا تو لب و لہجہ اور زبان بھی تلخ اور الفاظ بھی فطری طور پر کھردرے ہونگے۔ لیکن چونکہ یہ لہجہ اور زبان مضمون کے مطابق ہوگا اس لیے اس میں کھردرا پن کھردرا پن نہیں رہے گا بلکہ ایک پُر تاثیر کیفیت، حسن، صداقت اور جمالیاتی رچاؤ کو جنم دے گا۔ یہی جمالیاتی رچاؤ اقبال کے ہاں بھی ہے، یگانہ کے ہاں بھی اور تنویر سپرا کے ہاں بھی۔ البتہ نازک سماعتوں پر ایسے شعر ضرور بار گزرتے ہیں۔ یہ وہ روایت پرست نازک سماعتیں ہیں جو لکھنؤ، دلی اور قلعۂ معلیٰ کے کلچر میں ڈھلی ہوئی ہیں (یہاں اس کلچر اور زبان پر طنز مقصود نہیں کہ خود راقم الحروف کے والدین خالص دلی سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی تہذیب میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اور یقیناً راقم پر اس کے اثرات بھی ہیں) لیکن سوال یہ ہے کہ جو خیالات اور جو شاعری بیسوی صدی کے نصف آخر کے صنعت زدہ ماحول اور کارخانوں مشینوں سے پھوٹ رہی ہو وہاں دلی لکھنؤ کا نفیس نازک لہجہ کیسے جنم لے سکتا ہے، وہاں تو مشینوں جیسا تلخ اور خشک لہجہ ہی جنم لے گا اور یقیناً یہی اس کی ادبیت اور جمالیات ہے ورنہ اس کا مطلب ہے کہ لفظ و معنی کی مطابقت نہیں ہے۔ ایسی مطابقت، ایسی جمالیات اور ایسی ادبیت یقیناً روایت زدہ ''نازک سماعتوں'' پر بار گزرے گی لیکن چونکہ جمالیات کا معیار موضوعات کے ساتھ بدلتا ہے یا یوں کہیے کہ ادبی حسن بھی ارتقا پذیر ہے اس لیے اگر بے تعصبی کے ساتھ تنویر سپرا کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا تنویر سپرا نے غزل کے مزاج میں انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے۔ جس ارتقا اور انقلاب کا آغاز اقبال نے کیا تھا تنویر سپرا نے اردو غزل میں اسی راستے کو مزید تراشا، بنایا اور سنوارا ہے۔ اس نے انتہائی تخلیقی آزادی اور جرأت اظہار کے ساتھ غزل کے موضوعات اور اسالیب و زبان میں انقلاب برپا کیا ہے۔ اس نے جدید غزل کی روایت میں موضوعاتی اضافوں کے ہمراہ فنی جمالیاتی سطح پر بھی انفرادیت اور جدت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی غزل صحیح معنوں میں جدید صنعتی مشینی ماحول کو پیش کرتی ہے۔ موضوعات کی سطح پر بھی زبان کی سطح پر بھی۔ اس نے زندگی کی نہایت خشک، سپاٹ، بے رنگ، کھردری اور تلخ سچائیوں نہایت حسن اور سلیقے کے ساتھ اپنی غزل میں سمویا ہے۔ اس کے ہاں جو خشکی، تلخی، کھردرا پن ہے وہ دراصل اس کے ہاں نہیں بلکہ یہ زندگی کے تلخ حقائق میں موجود ہے اور یہی زندگی اس کے اشعار میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس کے ہاں جو کرختگی ہے وہ زندگی کی کرختگی ہے۔ اس کے ہاں جو 'دریا کا شور' ہے وہ زندگی کا شور ہے۔ آہوں، آنسوؤں، نالوں، چیخوں اور بین کا شور ہے، کراہوں اور فریادوں کا شور ہے۔ ان حقوق کا شور ہے جو چھین لیے گئے ہیں۔ اس کے ہاں جگہ جگہ مشینوں، شفٹوں، لوہے، ہتھوڑے، ریگ مال، پرزوں کا ذکر آیا ہے۔ مشین، ریگ مال، پلاسٹر، ایکس رے، پاکٹ، شفٹ، اوورٹائم، آئل کین، بم، سگریٹ،

میٹر، وہسکی، بنگلہ، کاریں، سیٹھ، جاہل، غیر مہذب، محنت، جنٹلمین، آجر، سگرٹ مل، مل مالک، غلیظ جسم، رئیس، چھت کی کڑیاں، بوسیدہ ٹاٹ، اونچی حویلی کی کھاٹ، بابو کا ہاتھ، پلاٹ، مزدور، پگھلا ہوا سیسہ، مشینوں کی صدا، گرانی، مہنگائی، چمنیاں، بھری ہوئی بندوق، منڈی، نرخ، نظامِ زر، صنعت، زر دار جیسے الفاظ و تراکیب عام استعمال ہوئے ہیں لیکن اکھڑے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ یہ خالصتاً جدید صنعتی ماحول اور کارخانوں مشینوں کی پیداوار ہیں اور ایک بالکل نئی چونکا دینے والی فنی جمالیات اور صنعتی ذہن کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ مغل جمالیات کی بجائے جدید صنعتی عہد کی صنعتی جمالیات کو سامنے لاتے ہیں۔

غرض تنویر سپرا کے ''لفظ کھر درے'' بااعتماد انسانوں بلکہ پسے ہوئے عوام اور مزدوروں کا ''تیز نغمہ'' ہے۔ اس نے اپنی تخلیقی آزادی کے سبب اردو کی اس نہایت بلیغ صنف سخن یعنی غزل کو ہمارے صنعتی عہد کے ''پامال انسان کی اجتماعی اور انقلابی پکار''[۱۶] بنا دیا ہے۔

تنویر سپرا کی غزل پاکستان کے جدید صنعتی محنت کشوں میں سے ابھرنے والے جدید صنعتی مزدور غزل گو کی 'سچی' کھری اور منفرد آواز ہے۔ یہ آواز ایک جدید صنعتی محنت کش کی جدید آواز بھی ہے اور زیردست لیکن جمہوریت پسند، روشن خیال، ترقی پسند، آزادی کے قائل طبقات کی اجتماعی اورانقلابی پکار بھی۔ یہ فلک نژاد کی آواز نہیں خاک زاد کی آواز ہے، خاک زادوں کی پہچان اور ترجمان ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ تنویر سپرا، ''اپنی بات''، مشمولہ؛ ''لفظ کھر درے''، گندھارا بکس، راولپنڈی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷

۲۔ مندرجہ بالا سوانحی بیانات کے سلسلے میں تنویر سپرا کے بارے میں یوسف حسن کے مختصر سوانحی خاکے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ دیکھئے: لفظ کھر درے، ص ۹، ۱۰، ۱۸۷؛
کچھ سوانحی کوائف ''وفیاتِ اہلِ قلم''، مرتبہ محمد منیر احمد سلیچ، ڈاکٹر، میں بھی موجود ہیں۔ شائع شادہ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۶)

۳۔i- یوسف حسن، ''آہن گر، آئینہ گر''، مشمولہ؛ ''لفظ کھر درے''، ص ۱۸۷، ۱۸۸

۳۔ii- ترقی پسندی کے اس سفر یا نو ترقی پسندی کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے:

(i) رشید امجد، ڈاکٹر، ''پاکستانی ادب: رویے اور رجحانات''، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۸۴-۸۷، ۴۹ تا ۵۲

(ii) رشید امجد، ڈاکٹر، مضمون ''پاکستانی ادب کے نمایاں رجحانات''، مشمولہ؛ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال (کتابی سلسلہ عبارت-1)، مرتبہ نوازش علی، ڈاکٹر، راولپنڈی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸ تا ۲۶

۴۔ یوسف حسن، ''آہن گر، آئینہ گر''، مشمولہ؛ ''لفظ کھر درے''، ص ۱۸۸

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ احسان دانش، ''نوائے کارگر''، مکتبہ دانش، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۸۷، ۱۰۶، ۱۱۱، ۱۲۴، ۱۳۹، ۱۴۵، ۱۵۲

۸۔ ایضاً، ص ۲۱۶

۹۔ یوسف حسن، ''آہن گر، آئینہ گر''، مشمولہ: ''لفظ کھر درے''، ص۱۹۲

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''صداقت کی شاعری''، مشمولہ: ''لفظ کھر درے''، ص۱۱

۱۱۔ فیض احمد فیض، ''دستِ سبا'' (ابتدائیہ)، مشمولہ: ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کارواں، لاہور، س ن، ص۱۰۳، ۱۰۴

۱۲۔ سارتر، ''پیش لفظ''، مشمولہ: ''افتادگانِ خاک از فنین''، ترجمہ: محمد پرویز، سجاد باقر رضوی، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۷ تا ۲۰

۱۳۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، ''بھٹو صاحب میری نظر میں''، روزنامہ جنگ، ملتان، ۵/اپریل ۲۰۱۱ء، ص۶ (ایڈیٹوریل پیج)

۱۴۔ فہمیدہ ریاض، (فلیپ) ''لفظ کھر درے''

۱۵۔ یگانہ، ''کلیاتِ یگانہ''، مرتبہ مشفق خواجہ، اکادمی بازیافت، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۴۹۶، ۲۲۲، ۴۵۴، ۲۳۱، ۵۰۲، ۳۲۰

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''صداقت کی شاعری''، مشمولہ: ''لفظ کھر درے''، ص۱۶